مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

اکبر اور اقبال

جب کسی محکوم قوم میں انقلاب و آزادی کی روح کروٹیں لینے لگتی ہے تو اُسے کئی قسم کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے پہل محکوم قوم یہ محسوس کرتی ہے کہ حاکم قوم ہمیں کسی بات میں اپنے برابر نہیں سمجھتی۔ تعلیم میں، عہدے میں، قانون میں، معاش میں، غرض کسی گوشۂ زندگی میں مساویانہ حقوق دینے کو تیار نہیں اور اس کے باوجود ہمارے بہت سے قابلِ قدر حضرات اس کی غلامی اور خدمت گزاری کو اپنی زندگی کی قابلِ فخر کامیابی سمجھتے ہیں۔ حاکم قوم کی طرف سے اس قسم کے غیر مساویانہ بلکہ ذلت آمیز سلوک کا پے در پے مظاہرہ ہوتا ہے تو محکوم قوم کے دل بیزار ہونے لگتے ہیں۔

اس ابتدائی مرحلے پر صرف چند ہی غیرت مند نفوس ہوتے ہیں جن کے اندر غیرتِ قومی جوش زن ہوتی ہے اور خیالات میں تموّج پیدا ہونے لگتا ہے۔ خیالات و افکار میں انقلابی حرکت تو پیدا ہوتی ہے لیکن زبان پر نہیں آتی۔ زبان پر نہ آنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو اس کے لیے ساز گار نہیں پاتے۔ اپنے چاروں طرف وہ بے حسّوں، غافلوں، خوشامدیوں اور مطمئن دلوں کا ہجوم دیکھتے ہیں اور خاموش رہ کر اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ اِدھر بات زبان پر آئی اور اُدھر مخالفتوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ لوگ تو بات ہی نہیں سمجھیں گے۔ کچھ حضرات مجنون کی بڑ سمجھ کر سُنی ان سُنی کر دیں گے۔ کچھ مہربان بات کو سمجھ تو لیں گے لیکن تلخ نتائج کو بھانپ لینے کی وجہ سے واقعی مخلصانہ طریقے پر خاموش رہنے کی نصیحت فرمائیں گے، اور کچھ احباب ایسے بھی ہوں گے جو غلامی میں پختہ ہونے یا خرید لیے جانے کی وجہ سے پوری مخالفت کر کے حقِ نمک ادا کر دیں گے۔ بہر حال انھیں کسی طرف سے تائید و لبیک کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اس لیے ایک عرصے تک وہ خاموش رہتے ہیں۔ لیکن جب مسلسل چوٹیں پڑنے کے بعد پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے تو اندرونی احساسات چھلک کر باہر آجاتے ہیں اور الفاظ کا پیکر اختیار کر کے نوکِ زبان سے نکلنے لگتے ہیں۔ گویا بات دماغ سے چل کر زبان پر آتی ہے اور یہ دوسرا مرحلہ ہوتا ہے۔ زبان کے بعد تیسرا مرحلہ ہاتھ پاؤں یعنی عمل کا ہوتا ہے اور یہ انقلاب کا تیسرا اور آخری مرحلہ ہوتا ہے۔

سودا جب تک دماغ میں بند رہتا ہے قانونی گرفت سے باہر ہوتا ہے لیکن جب زبان پر آتا ہے تو آزمائشیں بھی لنگر لنگوٹ کس کر تیار ہونے لگتی ہیں۔ اس وقت حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ مقصد تو اپنا ہی بیان کیا جائے لیکن اسے ایسے رمز و کنایہ میں لپیٹ کر ادا کیا جائے کہ سمجھنے والے تو اچھی طرح سمجھ لیں لیکن قانونی دارو گیر کی وہاں تک رسائی نہ ہو سکے۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں ادب، شاعری اور طنز و مزاح کے حربے کام آتے ہیں۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ کہیں تو ریہ وایہام ہوتا ہے کہیں رمز و کنایہ۔ کہیں طنز و مزاح ہوتا ہے اور کہیں ذو معنیین اشارہ۔ قید و بند کی سختیوں کا ذکر کرنا ہو تو بلبل و صیاد کا رمز یہ پیش کیا جاتا ہے:

پروں کو کھول دے ظالم جو قید کرنا ہے　　قفس کو لے کے میں جاؤں گا کہاں صیاد

کچھ زبان سے نکالنا جرم قرار دیا جائے تو اُسے یوں ادا کیا جاتا ہے:

لبوں تک نام آیا تھا کہ بجلی کوند کر آئی　　قفس میں یہ بھی مشکل ہے کہ ذکرِ آشیاں کر لیں

جو لوگ محض اس لیے غلامی کو پسند کرتے ہیں کہ آزمائشوں میں کون پڑے، ان کے بارے میں یوں کہا جاتا ہے:

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں　　گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

جب اپنے یگانے غیروں کا ساتھ دینے لگیں تو اس کا گلہ یوں کیا جاتا ہے:

کس رہے ہیں اپنی منقاروں سے حلقہ جال کا　　طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

اس قسم کے مضامین کے اظہار میں دو چیزیں بڑی کام آتی ہیں۔ ایک شعر۔ دوسرے مزاح۔ شعر کو یہ خصوصی رعایت حاصل ہے کہ جو کچھ چاہیے کہہ ڈالیے۔ سننے والے جھوم جھوم کر داد دیں گے اور اگر وہی بات نثر میں کہیے تو اچھی خاصی مرمت ہو جائے گی۔ خسرو نے کہا:

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست　　ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند　　آرے آرے می کنم با خلق عالم کار نیست

ذرا کسی خطیب سے کہیے کہ یہی مضمون نثر کر کے ذرا خطبۂ جمعہ میں تو کہہ کر دیکھ لے۔ اگر اسے مسجد سے باہر نہ نکال دیا جائے تو میرا نام نہیں۔

دوسری خصوصی رعایت شعر کو یہ حاصل ہے کہ اس کے وزن، ردیف و قافیہ کی لطافت، ردم اور موسیقیت کی وجہ سے شعر ہر خاص و عام کی نوکِ زبان پر محفوظ ہو جاتا ہے اور خود بخود پھیلتا جاتا ہے۔ بہت سے غیر شاعر لوگوں کو بھی سینکڑوں اشعار یاد ہوتے ہیں لیکن کسی نثر کا آدھا صفحہ بھی زبانی یاد نہیں رہتا۔

شعر کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ کئی صفحوں کا مفہوم ایک شعر میں سمٹ کر آجاتا ہے
شعر کی ایک چوتھی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جو مفہوم شعر میں ادا ہو جاتا ہے اسے اگر نثر میں ادا کیا جائے تو سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر کسی دوسری زبان میں اس کا نثری ترجمہ کیا جائے تو ذوقِ سلیم کے لیے اس بارِ گراں کو برداشت کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

غرض ایسی کئی خصوصیات ہیں جو شعر کو نثر سے زیادہ مقبول بنا دیتی ہیں اور قومی انقلاب کے ابتدائی مرحلے میں یہ ایک ایسے خنک مرہم کا کام دیتا ہے جس میں بے قرار کر دینے والی سوزش نہیں ہوتی۔ اس مرحلے پر جب شعری لطافتوں میں مزاح و ظرافت کی بھی آمیزش ہو جائے تو لطف دو بالا سونے پر سہاگا اور مقبولیت میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بات تو جلدی پھیل کر دلوں تک پہنچ جاتی ہے مگر شعری لطائف میں کھپ جانے کی وجہ سے قانون دارو گیر اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے اور حرکت میں آنے سے کتراتا ہے۔ جوں جوں اس اندازِ کلام کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے توں توں صاف گوئی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایسے لوگ کھلی بغاوت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ مناسب وقت آنے تک حاکم قوم سے ان کی ظاہری لفظی وابستگی قائم رہتی ہے اور یہی وابستگی انھیں قانونی گرفت سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہ اسی حالت میں آہستہ آہستہ اپنا پیغام پہنچا کر دلوں کو گرماتے برماتے رہتے ہیں اور ان کی شاعری آنے والے تیسرے مرحلے یعنی مکمل انقلاب کے لیے کھاد اور پانی کا کام کرتی رہتی ہے۔ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے لطیفے اور چٹکلے اور طنزیہ تمثیلات وہ کام کر جاتے ہیں جو لمبی لمبی فلسفیانہ تقریریں نہیں کرتیں۔

حضرت اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال دونوں اسی دوسرے مرحلے کے آغاز کی پیداوار ہیں۔ دونوں نے اپنی اپنی جگہ ایک ہی حقیقت کو محسوس کیا۔ دونوں کے دل ایک ہی چوٹ کھا کر تڑپے۔ دونوں کے دماغ کا سودا ایک ہی تھا۔ دونوں کے قلبی احساسات نے شعر کا پیکر اختیار کیا اور دونوں نے حاکم قوم کے ایک ایک جوڑ، بند پر بھرپور وار کیے۔ دونوں کی اساس فکر اسلام اور صرف اسلام تھا۔ دونوں کے تصورات کا مرکزی نقطہ ذاتِ رسالت مآب تھی اور امتِ محمدیہ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ان دونوں نے محسوس کیا کہ اسلامی قدریں، اسلامی تمدن و تہذیب اور اسلامی ثقافت مغلوب ہوتی جا رہی ہے اور انگریزی کلچر چھاتا جا رہا ہے۔ دونوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب کی چمک دمک مسلمان قوم کے دل و دماغ پر اس طرح مسلط ہوتی جا رہی ہے کہ ان کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں اور اسلامی اصول کو واشگاف لفظوں میں پیش

کرتے ہوئے مسلمان شرماتے ہیں اور اگر پیش بھی کرتے ہیں تو معذرت خواہانہ انداز میں ـــ یہ دیکھ کر دونوں کے دل بے چین ہو گئے۔ دونوں نے مقابلے کے لیے اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیے۔ کہیں انگریزی تہذیب پر حملے کیے کہیں انگریزی نظام تعلیم پر، کہیں غیر اسلامی تصورات کی دھجیاں بکھیریں، کہیں مغرب پرستی کے پرخچے اُڑائے۔

ہاں ان دونوں میں ایک بڑا فرق بھی ہے اور وہ ہے اندازِ بیان کا فرق۔ اسے بہت مختصر لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک بات کو اکبر واہ کے ساتھ کہتے ہیں اور اقبال آہ کے ساتھ کہتے ہیں۔ اکبر گدگداتے ہیں اور گدگدا کر نشتر کے لیے آمادہ کرتے ہیں اور اقبال کچھ لذت آمیز نشتر لگا فاسد مادہ بہا دیتے ہیں۔ اکبر کی واہ دلوں کو کھینچتی ہے اور اقبال کی آہ ان کھنچ کر آنے والوں کو بے چین کر کے منزل کی طرف دوڑا دیتی ہے۔

اقبال نے رائج الوقت نظام تعلیم کی اس عیاری کو محسوس کیا جس کا مقصد دین سے ہٹانا اور حاکم قوم کے لیے سستے غلام پیدا کرنا تھا۔ انھوں نے ایک ہی شعر ایسا کہہ دیا جو پوری کتاب اور پورے دیوان پر بھاری ہے۔ وہ کہتے ہیں:

گلہ تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا　　کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اکبر نے اس حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

انگریز عرصۂ دراز تک ہمارے سروں پر مسلط رہے لیکن ہمیں ایک سوئی بنانا بھی نہ سکھایا۔ بس ریسرچ کے نام سے بہت سے ان علوم کی ڈگریاں دیتے رہے جن سے کوئی سیاسی قوت نہ پیدا ہونے پائے۔ وہ کیا پڑھاتے رہے، اسے اقبال ہی کی زبان سے سنیے:

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی　　موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

اس نظامِ تعلیم کے متعلق اکبر نے جو کچھ کہا ہے اسے بھی سنیے:

نظر ان کی وہی کالج کے بس علمی فوائد پر　　گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

اقبال کہتا ہے:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اکبر کہتا ہے:

مسجد سے نماز اور وظیفہ رخصت　　کالج سے امام ابوحنیفہ رخصت

یہ بھی کہا:

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں　　　　کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اقبال کہتے ہیں:

علم و حکمت از کتب، دین از نظر

اکبر نے کہا:

نہ تو مکتب سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا　　　　دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

انگریزی حکومت نے ہمیں کو لوٹ کر رزق کے سرچشمے اپنے قبضے میں کر لیے اور اس میں سے تھوڑا ہمیں دے دلا کر غلامی پر مجبور کر دیا اور ہم سے چھین کر جو تھوڑا بہت دیا اس پر احسان جتایا اور ہم اس تھوڑے پر بھی بہت خوش ہوتے رہے۔ یہ انداز اقبال کو کھا گیا۔ انھوں نے کہا:

فرنگ آئینِ رزاقی بداند　　　　بہ دیگر بخشد و باز می ستاند

بہ شیطاں آں چناں روزی رساند　　　　کہ یزداں اندراں حیراں بماند

اکبر نے کہا:

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں　　　　یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

نیز کہا:

یہ اپنے جی میں تو ٹھان لی تھی کہ صرف یادِ خدا کریں گے　　　　مگر معاً یہ خیال آیا، ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

قرآن پاک کے متعلق اقبال اور اکبر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اُمت نے قرآن کو وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق تھا۔ اُمت نے قرآن سے بے اعتنائی برتی اور دوسری کم درجے کی چیزوں پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے اُمت میں افتراق پیدا ہو کر اتحادِ اُمت پارہ پارہ ہو گیا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　　　یہ امت روایات میں کھو گئی

اسی مضمون کو اکبر نے دو شعروں میں یوں ادا کیا ہے:

سر رشتۂ توحید جو ہم سے چھوٹا　　　　آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لوٹا

قرآن کی عظمت کو مٹانے کے لیے　　　　ہر سمت سے راویوں کا لشکر ٹوٹا

اپنے زمانے کے پُر فتن دَور میں دونوں شاعروں نے یہ محسوس کیا کہ اسلام سے بے گانگی، خدا اور اس کے

رسول سے بے تعلقی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا گلہ اقبال نے یوں کیا:

عصرِ ما مارا زِ ما بے گانہ کرد از جمالِ مصطفٰے بے گانہ کرد

اکبر یہ رونا یوں روتے ہیں:

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یہ چند نمونے محض ایک ابتدائی قدم ہے ورنہ دونوں کی مماثلتِ افکار کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔

یہاں ایک ضروری الجھن کو صاف کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اکبر نے سر سیّد جیسے دردمند مصلح پر کئی جگہ طنز کی ہے۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ اکبر جدید تعلیم کے مخالف تھے اور سر سیّد کی تعلیمی تحریک اور حریّتِ فکر میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ہماری دانست میں یہ الزام درست نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اکبر اور اقبالؔ دونوں جس بات کو اپنے خیال میں یا اپنے تصوّر کے مطابق اسلام کے لیے غیر مفید یا مضر سمجھتے تھے اس کے لتّے لینے میں کوئی تامّل نہیں کرتے تھے۔ کبھی نام لے کر اور کہیں نام لیے بغیر۔ اس معاملے میں انھوں نے کسی کو نہ بخشا، نہ ملّا کو نہ صوفی کو نہ حکام کو نہ لیڈر کو نہ عوام کو نہ خواص کو۔ اگر اکبر نے یہ کہا:

نکلے سید جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے شیخ قرآن دکھاتا رہا چندہ نہ ملا

تو اقبال نے بھی کہا:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

اگر اکبر کی طنز پر ہمیں اعتراض ہے تو سیّد جمال الدین افغانی پر بھی اعتراض ہونا چاہیے۔ انھوں نے بھی سر سیّد کی نیچریت پر کچھ کم ملامتیں نہیں کی ہیں۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی پر بھی یہی اعتراض ہونا چاہیے جو سر سیّد کی تعلیمی تحریک کے سرگرم حامی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی روحِ رواں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ٹرسٹی ہونے کے باوجود سر سیّد کے بعض مذہبی رجحانات کے سخت مخالف تھے اور خود سر سیّد نے بھی ان کی ایک تقریر[1] شائع کرتے ہوتے ان پر یوں طنز کی تھی کہ:

"اس تقریر میں انھوں نے نیچریوں کا بھی نام لیا ہے مگر جو تقریر انھوں نے کی ہے اس سے تو وہ خود

---

[1] یہ تقریر ندوۃ العلما کے پہلے اجلاس میں ہوئی تھی اور سر سید نے تہذیب الاخلاق مجریہ محرم ۱۳۱۲ھ میں ایک دلچسپ نوٹ کے ساتھ شائع کی تھی۔

بھی نیچری ہی معلوم ہوتے ہیں۔"

ہم عصروں میں اس قسم کی طنز یہ چشمکیں تو بڑے بڑے ائمہ میں بھی ہوتی رہی ہیں اور رجال کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں۔ انسان فقط اپنے ناموں ہی میں مخلص نہیں ہوتا۔ اپنی باتوں اور اعتراضوں میں بھی مخلص ہو سکتا ہے اور اس کی طنز یہ اداؤں میں جذبۂ خیر اور نیک نیتی ہو سکتی ہے۔ بات کہنے والا بھی مخلص ہو سکتا ہے۔ اس پر اعتراض کرنے والا بھی مخلص ہو سکتا ہے اور اس اعتراض کا جواب دینے والا بھی مخلص ہو سکتا ہے۔ ان سبھوں کا نصب العین میں اتفاق ہی ہوتا ہے۔ صرف بعض فروع یا طریق کار میں اختلاف ہوتا ہے جو بعض اوقات شدت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ بالاتر از تنقید اور معصوم نہ سرسید تھے نہ ان پر اعتراض کرنے والے۔

دراصل بات یہ ہے کہ کوئی شے ہمہ تن سو فی صد خیر نہیں ہوتی۔ سرسید کی تحریک ایک بڑی ضروری تحریک تھی اور اس دور کے تقاضوں کے مطابق تھی لیکن غیر شعوری طور پر انگریزی الحاد کے خس و خاشاک بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ اکبر کی نظر جس بات پر گئی اسے انھوں نے یوں ادا کیا:

رہی ان کی نظر کالج کے بس علمی فوائد پر — گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

ان تمام باتوں کے علاوہ اکبر کے دو شعر جو انھوں نے سرسید کی وفات پر لکھے ہیں سارے شبہات کو دور کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا — نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی ہم تو یہ کہتے ہیں اے اکبر — خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے پر

انتخاب حدیث : مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب ان منتخب احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیل جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے۔ یہ مجموعہ حدیث کی چودہ کتابوں کا خلاصہ اور بے مثل انتخاب ہے۔

قیمت : ۳۵ روپے

ملنے کا پتہ : ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور